مالک بن نبی

جدید اسلامی فکر پر مستشرقین کے اثرات

ترجمہ

ڈاکٹر ظفر الاسلام خان

انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اینڈ عربک سٹڈیز

جدید اسلامی فکر پر مستشرقین کے اثرات

از: مالک بن نبی

ترجمہ: ڈاکٹر ظفر الاسلام خاں

بشکریہ و تجویز: جعفر بھٹی صاحب

پیشکش: طوبیٰ ریسرچ لائبریری

toobaa-elibrary.blogspot.com

جدید اسلامی فکر
پر
مستشرقین کے اثرات



مالک بن نبی

جدید اسلامی فکر
پر
مستشرقین کے اثرات

ترجمہ

ڈاکٹر ظفر الاسلام خان

انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اینڈ عربک سٹڈیز



مالک بن نبی

یہ کتاب الجزائری مفکر مالك بن نبی کی تصنیف
إنتاج المستشرقین وأثره فی الفكر الإسلامي
(بیروت ۱۳۸۸/۱۹٦۹) کا ترجمہ ہے

پہلا اردو ایڈیشن ۱٤۱۷/۱۹۹٦

ناشر برائے
انسٹی ٹیوٹ آف إسلامك اینڈ عربك سٹڈیز
نئی دهلی :



فاروس میڈیا اینڈ پبلشنگ پرائیویٹ لمیٹڈ
PHAROS MEDIA & PUBLISHING (P) LTD
P. O. Box 9701, D - 84 Abul Fazl Enclave - I
Jamia Nagar, New Delhi - 110025
Tel.: 692 7483, 693 2825 Fax: 683 5825
E-mail: zik.pharos@axcess.net.in

ISBN 81 - 7221 - 005 - 1

□ کتنے تعجب کی بات ہے کہ آج ہم ایسے تعلیم یافتہ مسلمان نوجوانوں کو دیکھتے ہیں جو کہ خود اپنے دین کے عقائد کو جاننے کے لئے یورو پین مصنفین کی کتابوں کو پڑھتے ہیں۔

□ تاریخ کی عادت ہے کہ وہ ایسی قوموں کو گھاس نہیں ڈالتی جو کہ نیند میں خرّاٹے لے رہی ہوتی ہیں۔ تاریخ انھیں ان کے خوبصورت خوابوں کی دُنیا میں مگن چھوڑ دیتی ہے جہاں یہ قومیں محوِ خواب اپنے اُن عظیم ہیروؤں کا نظارہ کرتی ہیں جو اپنا کام کرکے جا چکے ہوتے ہیں اور جب خواب سے یہ قومیں بیدار ہوتی ہیں تو خود کو ظالم و جابر حکمرانوں کے چنگل میں گرفتار پاتی ہیں۔

□ عالمِ اسلام کہیں جہل کے خلاف گولی کھا رہا ہے تو کہیں سامراج کے خلاف کیپسول نگل رہا ہے۔ کسی اور جگہ فقر کے خلاف کوئی کشتہ کھا رہا ہے تو کہیں ایک اسکول کھول رہا ہے۔ کہیں اپنی آزادی کے نعرے لگا رہا ہے تو کہیں کسی دور علاقے میں ایک فیکٹری کھول رہا ہے ـــ اگر ہم اس حالت کا قریب سے جائزہ لیتے ہیں تو شفایابی کی کوئی کرن نظر نہیں آتی ہے۔ ہمیں کہیں کسی تہذیب کا دور دور اثر نظر نہیں آتا ہے۔

□ کسی کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ ایسے حل اور مناہج پیش کرے جو امت کی تاریخ اور مقام کے ساتھ میل نہ کھاتے ہوں۔ ہر حل کو امت کے افکار اور خواہشات اور ماضی اور حال کی ضروریات کے ساتھ منسجم ہونا چاہیئے۔ مشرق و مغرب سے حلول درآمد کرنا نہ صرف بے سود کوشش ہے بلکہ اس سے مرض کے مزید بڑھنے کا خطرہ ہے۔ دوسروں کی تقلید نہ صرف جہالت بلکہ خودکشی کے مترادف ہے۔

مالک بن نبی

مقدّمہ

الجزائری مفکر مالک بن نبی (۱۹۰۵-۱۹۷۳ء) نہ صرف اس صدی بلکہ پوری اسلامی تاریخ کے اہم ترین مفکرین میں شامل ہیں۔ مفکرینِ اسلام کی چھوٹی سے چھوٹی فہرست بھی ان کے نام کے بغیر نامکمل رہے گی۔ اردو داں طبقہ کی محرومی ہے کہ مالک بن نبی کی تحریریں ان تک نہیں پہنچ پائی ہیں۔

مالک بن نبی نے زیادہ تر فرانسیسی زبان میں لکھا ہے۔ بعد کے زمانے میں انھوں نے کچھ نگارشات اپنی مادری زبان عربی میں بھی براہِ راست تحریر کیں۔ یہ سب تحریریں عربی زبان میں بالعموم میسر ہیں اور عالمِ عرب میں اپنا خصوصی مقام رکھتی ہیں۔ مالک بن نبی اپنی امت کی اصلاح و ترقی کے لئے ایک دردمند دل رکھتے ہیں اور عصرِ حاضر کو خوب پہچانتے ہیں۔

مالک بن نبی مشرقی الجزائر کے اہم شہر قسنطینہ میں ۱۹۰۵ء میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی سے الجزائر پر مسلط فرانسیسی سامراج کی وجہ سے انھیں عربی اور فرانسیسی دونوں زبانوں اور ثقافتوں سے واسطہ پڑا۔ تلاشِ معاش کے سلسلہ میں ۱۹۲۵ء میں وہ فرانس گئے، لیکن جلدی اپنے وطن واپس آکر ایک عدالت میں کلرک متعین ہوگئے۔ پانچ سال بعد وہ پھر فرانس گئے اور کئی کالجوں میں داخلہ کی کوشش میں ناکام ہونے کے بعد ایک ٹکنکل انسٹی ٹیوٹ میں داخلہ لے لیا اور ۱۹۳۱ء میں الیکٹریکل انجینئر بن گئے۔ وہیں انھوں نے ایک فرانسیسی عورت سے شادی کی جو مسلمان ہوگئی۔

۱۹۵۶ء تک وہ پیرس ہی میں رہے۔ اس کے بعد قاہرہ منتقل ہوگئے اور اپنے وطن الجزائر کی جنگِ آزادی میں شریک ہوگئے۔ الجزائر کی آزادی کے بعد ۱۹۶۳ء میں وطن واپس آئے اور محکمہ ہائر ٹکنکل ایجوکیشن کے ڈائرکٹر مقرر ہوئے۔ ۱۹۶۷ء میں انھوں نے اپنے عہدہ سے استعفیٰ دے دیا اور باقی وقت تصنیف و تالیف میں گزارا۔ اسی حال میں ۳۱ راکتوبر ۱۹۷۳ء کو ان کا انتقال ہوا۔ تاریخ یاد نہیں لیکن تقریباً ۱۹۷۰ء میں میری ان سے ایک مختصر ملاقات ہمارے مشترکہ دوست احمد فراج (مصری ٹیلی ویژن پر "نور علیٰ نور" کے پروڈیوسر) کے پاس قاہرہ میں ہوئی۔

مالک بن نبی کے نظریات کا خاص عنصر، جو اُن کو دوسرے اسلامی مفکرین سے ممتاز کرتا ہے، وہ یہ ہے کہ وہ جمال الدین افغانی اور ان کے شاگردوں کی طرح سامراج کو ہمارے تمام امراض کا سبب نہیں مانتے ہیں، بلکہ ان کا کہنا ہے کہ مرض خود ہم میں ہے۔ اپنی کتاب شروط النہضۃ (نشأۃ ثانیہ کی شرطیں) میں وہ کہتے ہیں کہ اگر ہم میں سامراج کو قبول کرنے کا مرض (القابلیۃ للاستعمار) نہ ہوتا تو سامراج نہ ہم پر کبھی مسلط ہوتا اور نہ ہم پر اثر انداز ہوتا۔ کسی نشأۃ ثانیہ کے لئے ہم کو اپنے نفسیاتی، فکری اور اجتماعی امراض کا علاج کرنا ہوگا۔ مالک بن نبی افکار کے ہول سیل امپورٹ کے بھی خلاف ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اشیاء کی طرح مغربی افکار بھی مغربی تہذیب کی پیداوار ہیں۔ موجودہ مختصر لیکن انتہائی اہم کتاب کا لب لباب یہ ہے کہ ہمیں اپنی فکر سازی خود کرنی ہے۔ جو قوم اپنے افکار خود نہیں بناتی وہ اپنے سامان بھی خود نہیں بنا سکتی ہے۔

مالک بن نبی تجریدی اصلاحی تحریک (جو اصلاح عقائد پر بہت زور دیتی ہے) کے بھی خلاف ہیں۔ ان کے خیال میں نشأۃ ثانیہ کے لئے عقیدہ میں تحریک اور مثبت قوت ضروری ہے۔

ان کی پہلی اور سب سے معرکۃ الآرا کتاب Le phénomene coranique (عربی: الظاهرة القرآنية) پیرس سے فرانسیسی زبان میں ۱۹۴۶ء میں شائع ہوئی اور آج بھی مقبول عام ہے۔ ان کی عربی اور فرانسیسی کتابوں کی فہرست اگلے صفحات میں دی جا رہی ہے۔

اردو میں آنے والی مالک بن نبی کی غالباً یہ پہلی تحریر ہے۔ اس کتاب کو ہم جلد ہی انگریزی میں بھی پیش کریں گے۔ اِن شاء اللّٰہ ہم مالک بن نبی کی مزید تحریریں کو اردو میں منتقل کریں گے اور خود ان کے بارے میں بھی اردو داں طبقہ کو مزید روشناس کرائیں گے۔

ڈاکٹر ظفر الاسلام خاں

مالك بن نبي كى عربي كتابيں

1- الظاهرة القرآنية ، الجزائر، ١٣٦٥هـ/١٩٤٦م .
2 - لبيك (رواية) ، الجزائر، ١٣٦٦هـ/١٩٤٧م .
3 - شروط النهضة ، الجزائر، ١٣٦٧هـ/١٩٤٨م .
4 - وجهة العالم الإسلامي ، باريس، ١٣٧٣هـ/١٩٥٤م .
5 - فكرة الأفريقية الآسيوية ، القاهرة، ١٣٧٥هـ/١٩٥٦م .
6 - النجدة .. الشعب الجزائري يباد ، القاهرة، ١٣٧٦هـ/١٩٥٧م .
7 - حديث فى البناء الجديد ، بيروت، ١٣٧٩هـ/١٩٦٠م .
8 - مشكلة الثقافة ، القاهرة، ١٣٧٨هـ/١٩٥٩م .
9 - الصراع الفكري فى البلاد المستعمرة ، القاهرة، ١٣٧٩هـ/١٩٦٠م .
10 - الصعوبات علاقة النمو فى المجتمع العربي ، القاهرة، ١٣٧٩هـ/١٩٦٠م .
11 - الاستعمار يلجأ إلى الاغتيال بوسائل العلم ، القاهرة، ١٣٧٩هـ/١٩٦٠م.
12 - فكرة كمنولث إسلامي ، القاهرة، ١٣٧٩هـ/١٩٦٠م.
13 - تأملات فى المجتمع العربي ، القاهرة، ١٣٨٠هـ/١٩٦١م.
14 - فى مهب المعركة ، القاهرة، ١٣٨٠هـ/١٩٦١م .
15 - ميلاد مجتمع ، القاهرة، ١٣٨١هـ/١٩٦٢م .
16 - آفاق جزائرية ، الجزائر، ١٣٨٣هـ/١٩٦٤م .
17 - مذكرات شاهد القرن (القسم الأول) ، الجزائر، ١٣٨٤هـ/١٩٦٥م .
18 - إنتاج المستشرقين وأثره فى الفكر الإسلامي الحديث ، القاهرة ، ١٣٨٩ هـ/١٩٦٩م.
19 - مذكرات شاهد القرن (القسم الثاني - الطالب) بيروت، ١٣٩٠هـ/١٩٧٠م.
20 - مشكلة الأفكار فى العالم الإسلامي ، القاهرة، ١٣٩١هـ/١٩٧٢م

21 - المسلم فی عالم الاقتصاد ، بیروت، ۱۳۹۲ھ/۱۹۷۲م.

22 - دور المسلم ورسالته فی الثلث الأخیر من القرن العشرین ، بیروت، ۱۳۹۷ھ/۱۹۷۷م .

23 - بین الرشاد والتیه ، طرابلس، ۱۳۹۸ھ/۱۹۷۸م.

مالك بن نبي کی فرانسیسي کتابیں

Le phénomene coranique (Alger 1946);
Lebbeik (Alger 1947);
Les conditions de la renaissance (Alger 1948);
Vocation de l'Islam (Paris 1954);
L'Afro-asiatique (Le Caire 1956);
S.O.S. Algérie (Le Caire 1957);
Idé d'un commenwealth Islamique (Le Caire 1957);
Perspectives algériennes (Alger 1964);
Memoires d'un temoin du siecle tome I (Alger 1965);
L'oeuvre des orientalistes (Alger 1967);
Islam et démocratie (Alger 1968);
Le sens de l'étape (Alger 1970).

اس کے علاوہ مالك بن نبي کی دوسری تصانیف بھی ہیں جو ابھی تک شائع نہیں ہوئی ہیں -

مستشرقین

سب سے پہلے ہمیں اصطلاح "مستشرقین" کا مفہوم متعین کرنا ہوگا۔ "مستشرقین" سے ہماری مراد وہ مغربی اہل قلم ہیں جو اسلامی فکر اور اسلامی تہذیب پر خامہ فرسائی کرتے ہیں۔ انہیں دو جماعتوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

الف: زمانہ کے اعتبار سے: قدیم مستشرقین مثلاً گربرڈور بیک اور سینٹ تھامس اکویناس وغیرہ، اور جدید مستشرقین جیسے کارے ڈوگو اور گولڈزیہر وغیرہ۔

ب: اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں ان کی تحریروں کے عام انداز کے اعتبار سے۔ ان میں سے ایک طبقہ اسلامی تہذیب کی مدح سرائی کرتا ہے اور دوسرے کا مقصد محض نکتہ چینی اور اس کی مقبولیت کو داغدار کرنا ہے۔

استشراق کا مکمل مطالعہ اسی ترتیب سے کرنا چاہیے۔ لیکن ایک مخصوص معاشرتی نقطہ نظر سے، جسے اس مضمون میں نمایاں کرنا ہے اور خود مضمون کے اختصار کے سبب، ہم یہاں قصداً ایک خاص پہلو پر ہی گفتگو کریں گے جو غالباً دوسرے پہلوؤں کو یہاں ترک کرنے کی وجہ جواز ہوگا۔

یہ واضح بات ہے کہ قدیم مستشرقین مغربی دنیا کے فکری دھارے پر نہ صرف یہ کہ ماضی میں بلکہ اب تک اثر انداز ہو رہے ہیں جب کہ ہم مسلمانوں کے افکار پر ان کا کوئی اثر ظاہر نہیں ہوا۔ قدیم مستشرقین کی تحریریں یقینی طور پر ان افکار کا محور تھیں جو یورپ کی نشاۃ ثانیہ کی بنیاد بنے۔ دوسری طرف آج جسے ہم اسلامی نشاۃ ثانیہ کہتے ہیں اس پر ان قدیم مستشرین کی تحریروں کا کوئی اثر دکھائی نہیں دیتا۔ اس لیے یہ مسئلہ ہم تاریخ کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔ اس طرح ہم اسلامی تہذیب پر نکتہ چینی کرنے والے مستشرقین کو بھی نظر انداز کر دیں گے۔ خواہ ہمارے اہل قلم پر وہ کسی نہ کسی طرح اثر انداز ہوئے ہوں یا انہوں نے اپنے زمانے میں اپنے یہاں کچھ شہرت بھی حاصل کی

ہو جیسے فادر لامانس وغیرہ۔ درحقیقت یہاں یہ ہمارا موضوع بحث نہیں ہے کیونکہ اس مفروضے کے باوجود کہ ان کی تحریروں کا ہماری ثقافت پر کسی حد تک اثر رہا ہے، وہ ہمارے مجموعی افکار کو مکمل طور پر متحرک نہ کر سکے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ہم میں ان کے خطرات کا فوری مقابلہ کرنے کی صلاحیت تھی کیونکہ قدرتی طور پر یہ ہمارے ثقافتی وجود کے دفاع کا مسئلہ تھا۔ اس کی واضح مثال دور جاہلیت کی شاعری کے بارے میں طہٰ حسین کی کتاب الشعر الجاهلي ہے۔ اس کتاب کی اشاعت سے ایک سال قبل برطانوی مستشرق مارگولیتھ نے شعر جاہلی کے بارے میں ایک مفروضہ پیش کیا تھا۔ طہٰ حسین کی مذکورہ کتاب کی اشاعت کے بعد مصر میں غم و غصہ کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اور مصطفیٰ صادق الرافعی کے شعلہ رقم قلم نے اسلامی جذبات کو ٹھیس پہنچانے والی اس کتاب کا اثر زائل کرنے کی کوشش کی تھی۔

لیکن اس کے برعکس ہم اسلامی تہذیب کی قصیدہ خوانی کرنے والے مستشرقین کے نمایاں اثر کو محسوس کر سکتے ہیں۔ ہمیں اس بات کا اندازہ ہے کہ اس قسم کے مدح خواں استشراق کے سلسلے میں ہمارا کوئی رد عمل ظاہر نہیں ہوا، کیونکہ بظاہر اس کے دفاع کی کوئی وجہ جواز نہ تھی۔ گویا اس سبب سے ہماری قوت مدافعت سلب ہو گئی۔

یہاں ہمارا موضوع بحث یہ ہے کہ ہمارے ثقافتی وجود کے دفاعی نظام میں قصیدہ خواں مستشرقین کے بارے میں جو یہ خلل پایا جاتا ہے۔ اس کا ایک صدی قبل سے اور خصوصاً اس بیسویں صدی کے دوران اسلامی معاشرہ کے بدلتے ہوئے افکار پر کیا اثر ہوا ہے؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلامی تہذیب کی تعریف و توصیف کرنے والے مستشرقین مثلاً رینو جس نے گزشتہ صدی کے وسط میں جغرافیہ پر ابوالفدا کی کتاب کا ترجمہ کیا، اور ڈوزی جس کے قلم نے اسپین میں عربوں کی

روشن صدیوں کو اجاگر کیا، اور سیڈیو جو زندگی بھر اس کے لیے برسرپیکار رہا تاکہ عرب عالم فلکیات وانجینیر ابوالوفاء کو "چاند کی حرکت کے دوسرے قانون" کا موجد قرار دیا جا سکے۔ اسی طرح آسین بلا تھیوس جس نے الاحیاتی کا میڈیا کے عرب ماخذ کا انکشاف کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان مغربی اہل قلم حضرات نے علمی حقائق کی برتری ثابت کرنے اور حقیقی تاریخ کو اجاگر کرنے کے لیے لکھا۔ اور یہ سب انہوں نے اپنے مغربی معاشرہ کے لئے کیا۔ لیکن ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ اسلامی معاشرہ کے دانشور طبقے پر یہ افکار زیادہ اثر انداز ہوئے ہیں۔

میں عمر کے اعتبار سے اس مسلم نسل سے تعلق رکھتا ہوں جو ان مغربی مستشرقین کی اس معنی میں احسان مند ہے کہ ان کے توسط سے اسے وہ ذریعہ ہاتھ لگا جس سے مغربی تہذیب کی چمک دمک سے متاثر اسلامی ضمیر کا احساس کمتری دور ہو سکتا تھا۔

لیکن اگر ہم اس مسئلہ کا اپنے حالیہ تجربات کی روشنی میں جائزہ لیں تو محسوس ہوگا کہ اس طریقے کے نتائج ہماری فکر و ثقافت کی خوش آئند تبدیلی تک ہی محدود نہیں رہے بلکہ دوسری طرف اس کے منفی اثرات بھی ظاہر ہوئے۔ انھیں اثرات کو ہم ان صفحات کا موضوع بحث بنانا چاہتے ہیں۔

اسلامی معاشرہ پر ان اثرات کی حقیقی شکل کا صحیح اندازہ لگانے کے لیے ہمیں اس قسم کے استشراق کا جائزہ اس کے اصل تاریخی مآخذ کی روشنی میں لینا ہوگا۔

یوروپ نے اپنی تاریخ کے دو مرحلوں میں اسلامی فکر کا انکشاف کیا ہے: قرون وسطیٰ کے مرحلے میں تھامس اکوناس سے پہلے اور بعد کے دور میں یوروپ نے اس فکر کا انکشاف اور ترجمہ کر کے اپنی تہذیب اور ثقافت کو مالا مال کر لیا تھا۔ اور اسی کے سبب وہ پندرھویں صدی کے آخر سے اپنی نشاۃ ثانیہ کی

جانب کامیابی سے گامزن ہوسکا۔

جدید سامراجی دور میں اس نے فکر اسلامی کا ایک بار پھر انکشاف کیا۔ اس بار ثقافتی ترمیم کے لیے نہیں بلکہ سیاسی ترمیم کے لیے۔ تاکہ وہ اپنے سیاسی منصوبوں کو اسلامی ملکوں کے حالات کے مطابق کرسکے اور ان حالات کو اسلامی ملکوں کے لیے اپنی طے شدہ پالیسیوں کے رخ پر موڑ کر مغلوب اقوام پر اپنی گرفت مضبوط کرسکے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اہل مغرب ان علمی کوششوں کے ذریعہ انسانیت کے تمدنی سرمایہ میں ان اقوام کی دین کی صرف ستائش کرنا چاہتے ہو۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ سیڈیو اور گوستاف لوبون جیسے مستشرقین حقیقی علمی جذبے کے تحت تحقیق وتلاش کر رہے تھے۔ لیکن یہاں اس بات کو سامنے رکھنا ضروری ہے کہ یہ تعارف ایسے تاریخی حالات میں ہوا جب اسلامی علوم کی یہ حیثیت نہیں تھی کہ ان کو اساتذہ کے لکچرز اور ان کی جدید تالیفات سے حاصل کیا جاسکتا، بلکہ وہ ایک طرح سے آثار قدیمہ کی شکل اختیار کرچکے تھے جن کا انکشاف مغربی اہل علم کے ہاتھوں محض اتفاقاً ہوا تھا۔ وہ انھیں منتقل کرنے میں کبھی دیانت داری اور کبھی بددیانتی سے کام لیتے۔ یہ سائنسی دریافتیں کبھی مسلمان علماء اور کبھی اہل یوروپ کی طرف منسوب کردی جاتی تھیں۔ اس طرح عظیم انکشافات کو اصل موجدوں کے بجائے دوسروں کی طرف منسوب کیا جاتا رہا جیسے خون کے دوران کا پتہ لگانے والا برطانیہ کے ولیم ھاروے (۱۵۷۸-۱۶۵۷) کو کہا گیا جب کہ دراصل مسلمان طبیب ابن النفیس اس سے چار سو سال قبل اس کا انکشاف کرچکا تھا۔

مذکورہ صورت حال میں عالم اسلام کو مغربی ثقافت سے زبردست دھکا لگا۔ اس کے دوطرح کے اثرات ظاہر ہوئے: ایک طرف تو اسے واضح احساس کمتری سے دوچار ہونا پڑا اور دوسری طرف اس احساس کمتری کے ازالہ

کی کوشش میں وقت اور قوت کا ضیاع ہوا۔ خواہ اس کی نوعیت کچھ بھی رہی ہو۔

اس صدمے نے مسلم دانشوروں کی ایک جماعت کی ثقافتی قوت مدافعت کے نظام کو تقریباً مفلوج کرکے رکھ دیا۔ اس احساس کمتری کے نتیجہ میں وہ مغرب کی ثقافتی یلغار کا مقابلہ نہ کرسکے اور فکری جنگ شروع ہوتے ہی کسی شکست خوردہ فوج کی طرح میدان میں اسلحے چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس قسم کے دانشوروں کو مغرب کی پوشاک، رہن سہن اور طور طریقے اپنانے میں ہی راہ نجات نظر آئی۔ خواہ ان کے اس طرز عمل کا مغرب کی حقیقی تہذیبی اقدار سے کوئی تعلق ہو یا نہ ہو۔

اسلامی فکر کے دو کیمپ

اس طرح اسلامی ثقافتی افق پر ایک نئی فکر نمودار ہونا شروع ہوئی۔ جو ایک طرف ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی (۱۸۵۷ء) کے بعد علیگڑھ یونیورسٹی کے قیام کی شکل میں سامنے آئی، تو دوسری طرف اسلامی نشاۃ ثانیہ کے بانی جمال الدین افغانی کے روپ میں۔ اب اسلامی فکر دو کیمپوں میں بٹ گئی۔ ایک مغربی علوم و فنون اور مادی اشیاء یہاں تک کہ مغربی لباس تک اپنانے کی دعوت دیتا تھا تو دوسرا احساس کمتری کے ازالہ کے لیے فخر کا انجکشن لے کر اپنے دل کو بہلاتا رہا۔

پہلی لہر کے نتیجے میں ذہنی، سیاسی اور سماجی میدان میں دو طرح کے اثرات رونما ہوئے: ایک علیگڑھ یونیورسٹی کے قیام اور دوسرا جمال الدین افغانی کی دعوت کی شکل میں ابھر کر سامنے آیا۔ مقاصد میں اختلاف کے باوجود دونوں نے جو یکساں طریقہ کار اپنایا وہ دونوں حالتوں میں عالم اسلام کو ترقی کی اس منزل تک لے گیا جو "شیئیت" اور "تکدیس" (مادی اشیاء اور وسائل کو جمع کرنے) کی شکل میں ظاہر ہوا۔

دوسری لہر جو مستشرقین کی تحریروں کے تعلق سے ہمارا موضوع

بخش ہے، اسے اپنے سفر کے لیے ہموار راستہ نہ ملا اور اسلاف پرستی کی ادبیات (لٹریچر) میں ملا، جو اسلامی تہذیب پر ڈوزی جیسے مستشرقین کی تحریروں کے منظر عام پر آنے کے بعد انیسویں صدی ہی سے وجود میں آگئی تھیں۔

بہر حال ہم دونوں مکاتب فکر کے درمیاں کوئی قطعی حد مقرر نہیں کر سکتے کیوں کہ دوسرا مکتب فکر پہلے سے کوئی علحدہ وجود نہیں رکھتا۔ بلکہ وہ فکر اسلامی میں عمومی طور پر سرایت کر چکا ہے اور اس نے ایسی صورت اختیار کر لی ہے جس میں مغربی ثقافت کی برتری کی ذلت کا اثر دور کرنے کے لیے اسی طرح فخر کے انجکشن کی تلاش ہوتی ہے، جس طرح منشیات کا عادی اپنی وقتی تسکین کے لیے کسی نشہ آور انجکشن کا متلاشی رہتا ہے۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس فکری مدرسہ اور اس کی ادبیات نے اسلامی معاشرہ کے مستقبل پر کوئی بہتر اثر مرتب نہیں کیا۔ یقیناً اسلامی معاشرہ کے تشخص کے تحفظ میں ان ادبیات نے قابل ذکر کردار ادا کیا ہے۔ میں جس نسل سے تعلق رکھتا ہوں وہ اپنے اسلامی تشخص کی بقا کے لئے اس لٹریچر کی بہ ہر حال احسان مند ہے۔ مثال کے طور پر میں نے پندرہ اور بیس سال کی عمر کے درمیان اسلامی تہذیب کی خوبیوں کو جن کتابوں کے ذریعہ دریافت کیا، ان میں ڈوسلان کا مقدمہ ابن خلدون کا فرانسیسی ترجمہ اور اس سے متعلق ڈوزی اور احمد رضا کی تحریریں بھی شامل ہیں۔

ذہنی و فکری بیماری اور اس کا علاج

ان کتابوں نے میرے ذہن و فکر پر کیا اثرات مرتب کیے ان کا مجھے بخوبی اندازہ ہے۔ میں نے اپنی سوانح حیات کی پہلی جلد میں اس کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ اس وقت جب کہ میری عمر ۶۰ سال سے تجاوز کر چکی ہے۔ میں چالیس سال کے تجربہ کے بعد نہ صرف یہ کے ذاتی بلکہ اسلامی معاشرہ کی سطح پر بھی اس علاج کی حقیقت کی نشاندھی کر سکتا ہوں۔ مختصراً اتنا کہنا کافی ہوگا کہ میرے

خیال میں متعدد اسباب کی بنا پر اس علاج کی خرابیاں خوبیوں سے کہیں زیادہ ہیں۔

پہلا واضح سبب ذہنی تشکیل اور اس کے نفسیاتی رد عمل میں نمایاں ہے۔ مثلاً جب ہم ایک غریب و مسکین سے (جو پیٹ بھر روٹی کا محتاج ہو) اس دولت و ثروت کا تذکرہ کریں جو ماضی میں اس کے آباء واجداد کے پاس تھی، تو گویا وقتی تسکین کے لیے ہم اسے کوئی نشہ آور چیز دے کر اس کی فکر و ضمیر کو مفلوج کر دینا چاہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم اس طرح اس کے غم کا مداوا نہیں کریں گے۔

اسی طرح ماضی کی شاندار روایات کا تذکرہ کر کے ہم کسی معاشرے کی بیماریوں کا علاج نہیں کر سکتے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ موحدین کے بعد کے دور میں فن قصہ گوئی کے ماہرین مسلمان نسلوں کو الف لیلہ کی کہانیاں سنا سنا کر ہر محفل کے بعد ان پر ایسا سرور طاری کر دیتے تھے کہ وہ ماضی کے سنہرے خواب سجائے نیند کی آغوش میں چلے جاتے تھے۔

لیکن دوسری صبح یہ عوام بیدار ہو کر پھر زندگی کے انھیں تلخ حقائق کا سامنا کریں گے جو کسی صورت قابل رشک نہیں۔

وہ ادبیات جن میں اسلامی تہذیب کے عہد زریں کا راگ الاپا گیا ہو، ان کے بھی دو کردار رہ جاتے ہیں ان کے ذریعے ایک خاص مرحلے میں مغرب کے ثقافتی چیلنج کا جواب دیا گیا اور دوسرے عوامل کے ساتھ وہ اسلامی تشخص کی بقاء کے لیے بھی مفید ثابت ہوئیں۔ لیکن دوسری طرف ان ادبیات نے اسلامی تشخص کو خود پرستی کے سانچے میں ڈھال دیا اور متحرک اور میکانیکی دور کے مطابق نہیں بنایا۔

اس خیال کو سرسری طور پر ایک عام بات سمجھ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا بلکہ یہ ہمارے لیے بہت غور و فکر کا مقام ہے۔ معاشرتی اعتبار سے تو اس کی اہمیت ہے ہی لیکن موجودہ دور میں عالمی سطح پر عوام عموماً اور اسلامی

سماج کی سطح پر خصوصاً افکار کی جو جنگ جاری ہے اسے دیکھتے ہوئے اس خیال کی اہمیت اور واضح ہو جاتی ہے۔

عالم اسلام کی فکری کش مکش

یہاں ہم عالم اسلام کی "فکری کش مکش" کے بارے میں اپنے مفہوم کو واضح کر دینا ضروری سمجھتے ہیں۔ یہ مسلمہ امر ہے کہ جب کوئی ایک یا چند مسلمان اپنے کسی سماجی مسئلے کو موضوع بحث بناتے ہیں تو اس سے پہلے سامراج کی زیر سرپرستی ماہرین کی ایک جماعت اس مسئلے کا جائزہ لینا شروع کر چکی ہوتی ہے۔ اس مسلم مفکر کو مسئلے کے حل میں جس قدر کامیابی حاصل ہوگی اتنی ہی تیزی کے ساتھ یہ ماہرین اس حل کا جائزہ لیں گے۔ اگر وہ غلط ہوا تو وہ کسی نہ کسی طریقے سے اس کی غلطی کی قوت میں مزید اضافہ کر دیں گے۔ اور اگر کچھ فائدہ مند نظر آیا تو وہ اس کی اہمیت کو گھٹانے اور اسے بے قیمت ثابت کرنے میں اپنا سارا زور صرف کر دیں گے تاکہ اس کا کوئی فائدہ ہی باقی نہ رہے۔

یہ اس فکری کشمکش کا عام اصول ہے جس کی ہم نشان دہی کرنا چاہتے ہیں۔ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ عالم اسلام میں جب کسی اہم پیش رفت کی جھلک دکھائی دے گی، خواہ وہ ہماری نگاہوں کے دائرے میں نہ ہو وہ تجربہ کے لیے فوراً ان ماہرین کے مائیکرو سکوپ کے نیچے پہنچ جائے گی۔ اگر اس میں انہیں عالم اسلام کی فکری تحریک سے ادنیٰ سا بھی ربط نظر آئے گا تو نشتر زنی کر کے اور کیمیاوی عمل سے گزار کر اس کے سماجی اثرات اور کارکردگی کی صلاحیت کو کم، اور اس کی راہ میں دشواریاں پیدا کرنے کی کوشش کریں گے۔

درحقیقت کسی معاشرے کا صحیح رخ معلوم کرنے کے لیے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ اس کے افکار کس رخ کو جا رہے ہیں۔ ان کا رخ سامنے (مستقبل) کی طرف ہے یا ایک مرض کی شکل میں انھیں پیچھے مڑ مڑ کر دیکھنے کی عادت ہے۔

فکری کشمکش کے ان دقیق احکام کا مزید جائزہ لیتے رہنے کے بجائے

آئیے ان کی روشنی میں زیر بحث موضوع کو دیکھیں کہ مدح سرائی اور فخر و مباہات کی یہ ادبیات موجودہ اسلامی معاشرے میں افکار کی رفتار اور سمت پر کیا اثرات مرتب کرتی ہیں؟

ہمارے ملکوں میں فکری کشمکش کے تاروں کو حرکت دینے والے ماہرین جب ان ادبیات کے ذریعے اپنا شیطانی کھیل شروع کر دیتے ہیں تو فوراً ہی ان ادبیات کا دوسرا رخ بھی ہمارے سامنے آ جاتا ہے۔ اس خطرناک عمل کا آج ہم اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر رہے ہیں اور اپنی فکری، سیاسی اور سماجی زندگی کے ہر گوشے میں اس کے اثرات دیکھ رہے ہیں۔ خصوصاً عرب ممالک میں، جہاں ایک عام شہری اور ادیب و صحافی کی حیثیت سے میرے تجربات و مشاہدات پروان چڑھے ہیں۔

ان تجربات و مشاہدات کو بیان کرنے کے لیے ایک مستقل کتاب بھی ناکافی ہوگی۔ یہاں صرف ایک واقعہ کی نشاندہی کی جاتی ہے۔

گزشتہ دنوں پیرس میں یورپ کے الجزائری مزدوروں کی کانفرنس منعقد ہوئی۔ کانفرنس کے ذمہ داروں نے ہمارے کسی مسئلے کے بارے میں ایک کتابچہ شائع کیا، اس مسئلے کا تعلق الجزائر سے تھا، جس کے آئین میں ملک کے نام کے ساتھ "ڈیموکریٹک" کی صفت کا بھی اضافہ کر دیا گیا ہے۔ فکری کشمکش کے ماہرین نے اس موقع کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ کتابچہ میں شامل افکار کا جن میں سے بعض کانفرنس کے سامنے اٹھائے جانے والے تھے راستہ کیسے روکا جائے، اور کانفرنس کے شرکاء پر ان کے اثرات کو امکانی حد تک کیسے کم کیا جائے؟ اس کا حل یہ نکالا گیا کہ شمس الله تشرق علی الغرب (مغرب پر عرب تہذیب کے احسانات) نامی کتاب کی مؤلف جرمن خاتون[1] کو

[1] فاضل مصنف کا اشارہ اَنّاماری شمیل کی طرف ہے (مترجم)۔

کانفرنس کی طرف سے دعوت نامہ بھیجا گیا۔ وہ اپنی کتاب کے ساتھ کانفرنس کے اجتماع میں شریک ہوئیں اور کانفرنس حال کے اہم مسائل سے ماضی کی شان وشوکت کی طرف متوجہ ہوگئی۔ میرے دوست نے جب یہ بتایا کہ آخر میں کانفرنس کے تمام شرکاء نے کھڑے ہوکر مذکورہ جرمن خاتون کو خراج تحسین پیش کیا تو انہیں خیال بھی نہیں آیا ہوگا کہ اس واقعے کا فکری کشمکش کے مسئلے سے کوئی تعلق بھی ہے یا نہیں؟

درحقیقت اس واقعے سے دو پہلو سامنے آتے ہیں؛ ایک یہ کہ مسلم عوام اپنے ماضی کی عظمت کے بارے میں حد سے زیادہ جذباتی ہیں، اور دوسرے یہ کہ ان کے حالیہ مسائل سے توجہ ہٹانے کے لیے مسلم عوام کی جذباتیت سے کس طرح کام لیا جا سکتا ہے۔

یہاں ہم اسی پہلو کو زیر بحث لائیں گے۔ کیوں کہ یہ دنیا کو درپیش فکری کشمکش کی موجوں کے ساتھ سامنے آیا ہے۔ نیز اس لیے بھی کہ بنیادی طور پر اس کا رخ عالم اسلام کی طرف ہے۔ یہاں تک کہ بسا اوقات اسلامی ملکوں کو اس کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ درحقیقت فکری کشمکش کو اپنے حق میں پھیرنے والے یہ ماہرین اس تاک میں رہتے ہیں کہ مسلم عوام کو جب فکر و عمل کی کوئی راہ دکھائی جانے تو وہ اس موقعے پر ایسے خیالات پیش کردیں جو زیادہ پرکشش ہوں اور مسلم عوام کو خوابوں کے خوش گوار لمحات اور الف لیلہ کی رنگین دنیا میں کھینچ لے جاتے ہوں۔

ہمیں اس عام اصول کو ہمیشہ مد نظر رکھنا چاہیے کہ ہمیں جب کسی مسئلے کا سامنا ہوگا اور ہم اس کا حل تلاش کر رہے ہوں گے تو فکری کشمکش کے ماہرین اس مسئلے سے ہماری توجہ ہٹانے اور اسے غلط رنگ میں پیش کرنے کی ضرور کوشش کریں گے۔

سیاسی میدان میں ہماری مشکلات کا جو حل شام کی بعث پارٹی، یا الجزائر میں بربر قومیت، پان افریکنزم، یا کمیونزم کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے یا وہ کمیونزم جیسے سامراج عرب دنیا میں پروان چڑھا رہا ہے، اور اسی طرح وہ لٹریچر جس میں ہمارے شان دار ماضی کی مدح سرائی کی گئی ہو۔ ان سب کو ہم سیاسی اور فکری میدان میں اصل مسئلہ سے توجہ ہٹانے کے وسائل کہہ سکتے ہیں۔ وہ عالم اسلام کی توجہ تمدن جیسے اہم ترین مسئلہ سے ہٹا کر اسے خیالی مسائل اور ان کے تصوراتی حل میں الجھا دینا چاہتے ہیں۔ ۵ جون ۱۹۶۷ء کو عرب اسرائیل جنگ میں عربوں کی شرمناک شکست اس سنگین صورت حال کا ایک بھیانک اور قدرتی نتیجہ تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ توجہ ہٹانے اور بہلاوے کی کارروائیوں کا مسئلہ پہلی جنگ عظیم کے زمانہ سے ہی موجود ہے۔ لیکن آج جب کہ عالم اسلام اپنی تاریخ کے نازک دور سے گزر رہا ہے اس مسئلے کی اہمیت اور بڑھ گئی ہے۔ یہاں تک کہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر عالم اسلام کی بعض ظاہری ترقیات کو نظر انداز کر دیا جانے تو آج سے چالیس سال قبل جب کہ یہاں سامراج کا غلبہ تھا، وہ اپنے مسائل کو بہتر طریقے سے حل کر سکتا تھا۔ کیوں کہ اس وقت اس کا روحانی یا نظریاتی اتحاد آج سے کہیں زیادہ پائدار تھا۔ لیکن اب جب کہ عالم اسلام آزاد ہو چکا ہے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے مقصد سے دور ہٹتا جا رہا ہے۔ کیوں کہ چالیس سال قبل تقسیم کے عمل جراحی سے اس کا یہ اتحاد پارہ پارہ ہو چکا ہے۔

اسلامی معاشرے کی اصل ضرورت

بعض ظاہری ترقیات سے قطع نظر یہی حقیقی صورت حال ہے۔ اس لیے اگر مجموعی طور پر تمام اسلامی معاشروں کے بارے میں یہ کہا جانے کہ وہ چوتھائی صدی سے کوئی ترقی نہیں کر سکے، بلکہ مزید پیچھے چلے گئے ہیں، تو ہماری اس بات سے حقیقت کا انکار لازم نہیں آنے گا۔ یہاں ہماری غلطی کا سبب

مسائل کو سیاسی پیمانے سے ناپنے کی ہماری عادت ہے۔ کیوں کہ ہم اسلامی مملکتوں کو تاریخ کے دو کناروں پر رکھ کر ان کی حالت کا موازنہ کرتے ہیں۔ یعنی دوسری جنگ عظیم سے پہلے جب اسلامی ممالک سامراج کے زیر اثر تھے اور جنگ کے بعد جب ان میں کے اکثر سیاسی آزادی حاصل کر چکے تھے۔ حالانکہ آزادی کی اس حقیقت پر ہم نے غور نہیں کیا۔ یہ ایسی آزادی ہے جو ان ملکوں کو اسرائیل جیسی چھوٹی ریاست کی تباہ کاریوں سے بھی نہ بچا سکی۔ اسلامی ملکوں کے چوتھائی صدی کے حالات یا ترقیات سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اسلامی معاشرہ اس عرصے میں اپنے حقیقی سرمایہ سے بھی ہاتھ دھو چکا ہے۔ اور یہ احساس مفقود ہو چکا ہے کہ تمام اسلامی معاشرے ایک ہی مستقبل سے وابستہ ہیں اور ان سب کے مسائل کا ایک حل ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ بعثیت، بربریت، افریقیت یا نقلی کمیونزم اور الف لیلہ کے خیالی قصے کہانیوں سے عالم اسلام کے غم کا مداوا نہیں ہو سکتا۔

آج عالم اسلام کے لیے یہ مسئلہ مزید سنگین ہو گیا ہے۔ آج مسئلہ ہماری بقا یا عدم بقا کا ہے۔ وقت کی رفتار دوسرے امکان کی نشاندہی کر رہی ہے، خصوصاً جون ۱۹۶۷ء کے واقعات کے بعد سے سیاسی اور فوجی بے بضاعتی کا احساس مزید شدت اختیار کر چکا ہے۔ کیوں کہ ان کی بنیاد "شیئیت" یعنی صرف مادی اشیاء کو جمع کرنے کے نظریہ پر رکھی گئی تھی۔ وہ مادی اشیاء جو ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ سے پہلے بیس سال کے عرصے تک ذاتی دفاع کے لیے اکٹھا کی گئی تھیں، لیکن وہ اسرائیل کے پہلے حملے ہی میں ریت کے گھروندوں کی طرح بکھر گئیں۔ اب یہ فخر کی بات نہ ہوگی کہ صیہونی ریاست کا مقابلہ کرنے کے لیے ہم نئے سرے سے اسلحے اور فوجی ساز و سامان جمع کرتے جائیں۔ محض مادی اشیاء کی جدت کاری قابل قدر اقدام نہیں ہے۔ بلکہ افکار کی بنیادی تجدید لازمی ہے۔ تاکہ وہ کمی پوری ہو سکے جو بھیانک اور شرمناک شکست کا سبب بن

سکتی ہے۔ اس لیے کہ زندہ افکار ہی سے انسان بڑے بڑے معرکے سر کرتا ہے۔

ہمیں اس حقیقت کا ادراک ہونا چاہیے کہ تاریخ کے نازک ترین موڑ پر کسی معاشرے کے مصائب کا سبب مادی اشیاء کی کمی نہیں بلکہ اس کا فکری افلاس ہوتا ہے۔

جون ۱۹۶۷ء میں صحرائے سینا کا سانحہ عرب قوم کی خصوصی حالت میں اس عمومی حقیقت کو نمایاں کرنے کی عملی کسوٹی ہے۔ یہاں ہم اس سے ایک عبرت یہ حاصل کر سکتے ہیں کہ اسرائیل نے عربوں کے پاس موجود ناکارہ اشیاء کے ڈھیر پر جو اچانک فتح حاصل کی تھی، اب اسے غیر متوقع دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ آج اس کا ایسے اشخاص سے مقابلہ ہے جو نئے افکار کے تحت حرکت میں آ چکے ہیں۔ بلکہ ان افکار نے ان کی شخصیت کو ایک نئے سانچے میں ڈھال دیا ہے۔ اسرائیل کے جنگی جہاز "ایلات" پر گولہ باری، اور اردن کی سرحدوں پر فلسطینی چھاپہ ماروں کا سرفروشانہ موقف، اسرائیل سے شکست کے بعد مادی اشیاء کی دنیا میں نہیں بلکہ عربوں کے افکار کی دنیا میں تبدیلی کا مظہر ہے۔

میں نے یہاں اسلامی معاشرہ میں افکار کے مسئلہ کا سرسری تذکرہ کیا ہے کسی اور موقعے پر اس اہم مسئلے کا تفصیلی جائزہ لیا جائے گا۔

خلاصۂ کلام

خلاصہ یہ کہ انیسویں صدی اور بیسویں صدی میں مغربی تہذیب کے مقابلے میں اسلامی ضمیر کو جو دھکا لگا اسے افکار کی دنیا میں خصوصیت کے ساتھ محسوس کیا گیا اور سائنسی افکار کی دنیا میں اس کا اثر زیادہ نمایاں ہے، یہاں تک کہ قرآن کی تفسیر بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکی! اس میں کوئی شک نہیں کہ طنطاوی جوھری کی ضخیم اور مفصل تفسیر کا بظاہر کوئی فائدہ نظر نہیں آتا۔

یہ تفسیری کام ایک طرف ہمارے افکار پر سائنسی اثرات کی نشاں دہی کرتا ہے تو دوسری طرف معلومات کا ڈھیر لگانے کا رجحان پیدا کرتا ہے۔ اس طرح یہ دشوار گزار عمل تفسیر قرآن سے زیادہ انسائیکلوپیڈیا بن کر رہ گیا ہے۔ فکر اسلامی کے سلسلہ میں اس بے فائدہ سائنسی رجحان کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ مغربی تہذیب کے مقابلے میں جس میدان میں اپنی کمی کا زیادہ احساس ہوا، اسے دور کرنے کی سعی لاحاصل کی گئی۔

یہاں بآسانی یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ مدح سرائی اور قصیدہ خوانی پر مبنی مستشرقین کے لٹریچر کو اس میدان میں اپنی منشیات کی کاشت کے لیے زرخیز زمین مل گئی۔ ہمارا موجودہ اسلامی معاشرہ اسے بڑے ذوق وشوق سے قبول کرتا ہے۔ اس لیے کہ یہ اس کے ضمیر پر نشہ کی کیفیت طاری کر کے اس کا غم غلط کر دیتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ ضمیر داخلی کشمکش کا شکار ہے، جسے کبھی تنظاوی جوھری، احمد رضا اور فرید وجدی جیسے مشرقی مؤلفین یا ڈوزی اور گوستاف لوبون جیسے مستشرقین کی کتابیں پڑھ کر سکون ملتا ہے، تو کبھی دوسرے دیگر مشرقی مؤلفین اور مستشرقین کی تصنیفات اسے مشتعل کرتی ہیں۔ کیوں کہ مصنفین کا آخرالذکر گروپ عربوں کے تمدنی عروج کے زمانے میں سائنسی ترقیات کے لیے ان کی خدمات کا اعتراف کرنے کے بجائے یہ کہتا ہے کہ ان کا کارنامہ صرف اتنا ہے کہ انہوں نے یونانی اور رومن تہذیب کو یوروپ تک پہنچایا تھا۔

مستشرقین کے سادہ لوح شاگرد

مستشرقین کے شاگرد، یہ مشرقی مؤلفین سامراجی حلقوں کی کھلی شہ پر اسلام کے خلاف تخریبی عمل جاری رکھے ہوئے ہیں وہ کھوکھلی ترقی پسندی کے نام پر اسلام سے ہر تمدنی خوبی سلب کر کے اسے عالم اسلام کی حالیہ پسماندگی کا ذمہ دار ٹھہرانا چاہتے ہیں۔ الایدیولوجیات العربیة فی محضر الغرب

(عرب افکار پر مغربی اثرات) کے نام سے ایک کتاب فرانسیسی مستشرق میکسیم روڈنسن کے مقدمہ کے ساتھ کچھ عرصہ قبل شائع ہوئی ہے۔ یہ کتاب مذکورہ مکتب فکر سے تعلق رکھتی ہے۔ کتاب کے مراکشی مؤلف روڈنسن کے شاگرد ہیں۔ اس مکتب فکر میں ایسے سادہ لوح بھی شامل ہو جاتے ہیں جو بے سوچے سمجھے مغربی ثقافت بلکہ مغربی سیاست میں قدم رکھ دیتے ہیں اور ایسے غیر اہم مسائل کا ناقص حل پیش کرتے ہیں جن کو وہ عالم اسلام کے اہم ترین مسائل تصور کرتے ہیں۔ ان کے بارے میں اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ ان کی نیت میں کھوٹ نہیں ہے۔ جب کہ فکری کشمکش کے ماہرین کے آلۂ کار دوسرے دانشور اپنے اسلوب اور طرز نگارش سے ہی پہچان لیے جاتے ہیں۔ وہ اپنے مستشرقین اساتذہ کی طرح فکر اسلامی کو بے قیمت ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ بلکہ ان سے ایک قدم آگے بڑھ کر ترقی پسندی کی بے معنی باتوں سے اسلامی فکر کے مستقبل کو مشکوک اور مبہم بنانا چاہتے ہیں۔

اس طرح اسلامی ضمیر داخلی کش مکش کا شکار رہتا ہے۔ کبھی قصیدہ خوانوں کی تحریریں اس کے لیے باعث تسکین ہوتی ہیں اور کبھی نکتہ چینوں کا قلم اسے مشتعل کر دیتا ہے۔ یہ کشمکش گزشتہ ایک صدی سے مسلسل جاری ہے۔ اس میں عالم اسلام کی مفید فکری صلاحیتیں ضائع ہو رہی ہیں۔ اس نے اسلامی فکر کی ترقی میں کوئی حقیقی کارنامہ انجام نہیں دیا۔ صرف دلکش ادبی آتش بازیاں ہی کی ہیں۔ ان دلکش آتش بازیوں میں "روح اسلام" کے نام سے سید امیر علی کی کتاب بھی شامل ہے۔

آج ہم ان تحریروں کا تجزیہ کریں تو دیکھیں گے کہ کیسی کیسی اعلیٰ فکری صلاحیتوں کو صحیح ڈھنگ سے استعمال نہ کر کے ضائع کیا گیا ہے۔ ان کے مقابلے میں یوروپ کی اصلاحی تحریک کے دوران لوتھر اور کالون کی تحریروں

نے زیادہ مثبت کردار ادا کیا تھا۔ اسی طرح ڈیکارٹ کی تحریروں نے یورپ کو ٹکنالوجی کے میدان میں ترقی کی راہ دکھائی اور مارکس، انجلز اور لینن کی تحریروں نے ایک ایسا نیا معاشرہ تشکیل دیا جو آج خلا کو سر کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

ہمارے کرنے کا کام

اب یہ بات واضح ہو گئی کہ مستشرقین کی دونوں طرح کی تحریریں اسلامی معاشرہ کے حق میں بری ثابت ہوئیں۔ کیونکہ انہوں نے اس کے ذہن میں محرومی کا احساس بھر دیا۔ خواہ وہ مدح سرائی یا قصیدہ خوانی کی شکل میں ہو جس نے موجودہ حقائق پر غور و فکر سے ہٹا کر ہمیں شاندار ماضی کی خیالی جنت میں پہنچا دیا۔ خواہ ہم پر اس طرح نکتہ چینی کی گئی اور ہمیں بے قیمت ثابت کیا گیا کہ ہم موحدین کے بعد کے زوال پذیر معاشرہ کے محافظ تصور کیے جائیں۔ اس صورت میں ہمارا فرض یہ ہے ہم مستشرقین کی تحریروں کو اسلامی نقطۂ نظر کے تحت علم و عقل کی کسوٹی پر پرکھیں، اور اسلامی حقیقت کو واضح کریں۔ اس لیے کہ اسلامی حقیقت کی وضاحت یا دفاع کا حق کسی دوسرے کو نہیں پہنچتا۔

اگر اس استشراق کا ہمارے لیے کوئی مثبت پہلو ہے تو وہ اسلامی فکر کی قصیدہ خوانی نہیں بلکہ اس پر ٹھوس تنقید کی صورت میں ہے۔ اس لیے کہ جب استشراق کی طرف سے یہ دعوی کیا جائے گا کہ عربوں نے سائنسی علوم میں کوئی حصہ نہیں لیا تو ہو سکتا ہے اس کی تلافی سطحی علمیت سے کی جائے۔ جیسا کہ طنطاوی جوہری نے اپنی تفسیر میں کیا ہے۔ لیکن مثبت اور ٹھوس تنقید کے نتیجے میں اس بات کا قوی امکان ہے کہ مخالفین اسلام کی شدت پسندی اور حقیقت سے انکار کی بنا پر اسلام اور سائنس کا مسئلہ ایک نئی شکل میں پیش کیا جا سکے، جو دین کے بلند مقام اور سائنس کی منطق سے زیادہ قریب ہو۔ ہمیں یہ کرنا ہے کہ قرآنی آیات میں خلا کو سر کرنے یا ایٹمی توانائی کے تجزیہ کا مفہوم

تلاش کرنے کے بجائے ہمارے سامنے اصل سوال یہ ہو کہ کیا قرآنی آیات کی روح سائنسی عمل کی راہ میں رکاوٹ بنتی ہے یا اس کی ہمت افزائی کر کے اسے ترقی دیتی ہے۔

درحقیقت ہمیں اپنے آپ سے یہ سوال کرنا چاہیے کہ کیا قرآن کسی معاشرے میں سائنسی ترقی کے لیے سازگار فضا قائم کر سکتا ہے؟ اور کیا وہ سائنسی علوم کو قبول کرنے اور انہیں دوسروں تک پہنچانے کے لیے لازمی ذہنی صلاحیتیں بیدار کر سکتا ہے؟

ہمیں نفسیاتی اور سماجی پہلو سے مسئلے کو پیش کرنا چاہیے، نہ کہ سائنسی علوم کی ترقی کے پہلو سے۔ اگر ہم فکر اسلامی کو اس پہلو سے صحیح ثابت کر سکیں تو اس کے کھاتے میں ان دو انکشافات کو درج کر سکتے ہیں، جن کے بغیر بیسویں صدی کی سائنسی ترقیات کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ آج نیوکلیائی سائنس کے باب میں جو حیرت انگیز ترقی ہوئی ہے کیا طبیعیات کے ماہرین اسے ریاضی کے قواعد اور الکٹرانک کیلکولیٹر کے بغیر حاصل کر سکتے تھے؟ اور کیا یہ آلات اعشاری نظام کے بغیر اپنا عمل جاری رکھ سکتے تھے جس کے ذریعے ہم مثلاً اووگدرو[1] کے صرف پانچ یا زیادہ صحیح یہ کہ سات نمبروں کو لکھ سکتے ہیں؟ کیا ریاضی کا یہ حیرت انگیز نظام اس ذہنی فضا کی دین نہیں ہے۔ جو اسلامی معاشرہ میں قرآنی تعلیمات نے قائم کی تھی؟

یہاں ہم ریاضیات کی ترقی میں الجبرا کے کردار پر بھی سوال اٹھائیں گے۔ جس نے مادی اعداد کے علم کو خالص رموز و علامات کا علم بنا دیا۔ الجبرا کا لفظ ہی اس کے عرب اصل کی نشاندہی کے لیے کافی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانی عقل اسلامی عقل کی اس معنی میں احسان مند ہے کہ اس نے ایک ایسا ذریعہ دیا جس کے بغیر انسانیت ریاضیاتی سائنس کے میدان میں ترقی نہیں کر سکتی تھی۔ ہمیں اس کی فکر نہیں کہ فرید وجدی کی طرح مستشرقین کے کاسہ لیس

---

(1) اووگڈرو Avogadro نمبر وہ ہیں جن کے ذریعہ کسی مادہ میں ایٹموں یا مالیکیولز کی تعداد کا تعین کیا جاتا ہے (مترجم)۔

شاگردوں نے بغیر کسی دلیل وثبوت کے الجبرا کو یونانی فلسفی دیوفانتوس کی طرف منسوب کر دیا۔ بلکہ اصل اہمیت اس بات کی ہے کہ الجبرا کا علم اس ذہنی فضا میں پیدا ہوا تھا جو قرآن نے قائم کی تھی۔

لیکن یہ ایک بے معنی طفلانہ حرکت ہوگی کہ سائنسی علوم کی ترقی کی نشاندہی کرتے ہوئے ہم اعشاری نظام اور الجبرا کو قرآنی آیات سے مربوط کر دیں۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم میں براہ راست اعشاری نظام یا الجبرا کا ذکر نہیں ہے، لیکن قرآن نے ایک ایسی نئی ذہنی فضا قائم کر دی جس میں سابقہ یونانی اور رومی دور کی طرح سائنسی علوم ترقی کی راہ پر گامزن ہوگئے۔ سائنسی ترقی کو صرف سائنس کی کامیابیوں میں نہیں دیکھنا چاہئیے بلکہ اسے ان تمام ذہنی اور سماجی حالات کے پس منظر میں دیکھنا چاہیے جن سے ایک مخصوص ماحول تشکیل پاتا ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ ہر دور میں عقل کی دلچسپی کے مراکز ذہنی فضا کی تبدیلی کے اعتبار سے بدلتے رہتے ہیں۔

ہم تاریخی اعتبار سے صنعت اور صنعت کاری کو ڈونیس پیبان کے انکشاف سے مربوط کر سکتے ہیں جس نے آگ پر رکھی ہوئی کیتلی کے ڈھکن کو بھاپ سے اوپر نیچے ہوتے دیکھ کر اسٹیم کی طاقت اتفاقیہ طور پر دریافت کرلی تھی۔

لیکن ہمیں یہاں اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ آگ کے انکشاف کے وقت سے لے کر یہ اتفاق تمام انسانی نسلوں میں پیش آتا رہا تھا لیکن پیبان کے دور تک کوئی شخص بھی بھاپ کی طاقت کا انکشاف نہیں کرسکا۔ ایسا کیوں تھا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ ڈونیس پیبان یا انگریز موجد واٹ اپنے تجربات اور جائزوں کو اس نئے ذہنی ماحول میں پروان چڑھا رہے تھے جو یورپ میں دو صدی پہلے سے قائم تھا جب ڈیکارٹ نے میتھڈ پر اپنی مشہور کتاب میں اس طرح پیشین گوئی کی تھی

ایسے علم کا حصول ممکن ہے جسکی زندگی میں نفع بخش طریقہ سے تطبیق کی

جا سکے۔ اس طرح درسگاہوں کو مثالی فلسفہ ترک کرکے ایسے فلسفہ کی تعلیم دینا چاہیے جو تطبیق کے قابل ہو مادہ آگ، ہوا، اجرام فلکی، اور آسمانوں اور ہماری زمین کے ارد گرد جو سیارے ہیں ان سب کے بارے میں معلوم کرکے ہمیں یہ موقع فراہم کرے کہ خود ان کے قانون کے تحت اسے اپنے ذاتی فائدے کے لیے استعمال کر سکیں تاکہ ہم فطرت کے مالک بن جائیں اور اس پر قابو پالیں۔

یہ عبارت واضح طور پر ڈیکارٹ کے بعد آنے والے سائنس اور ٹکنالوجی کے انقلاب کی پیشین گوئی اور اس راہ کی نشاندہی کر رہی ہے جسے سود مند علمی حقیقت کی تلاش کے لیے یورپی فکر اختیار کرے گی۔ یہ ضروری تھا کہ اس راہ پر چل کر یورپی فکر کو اسٹیم کی طاقت ملتی خواہ اسکا انکشاف کرنے والا ڈونیس پیبان ہوتا یا کوئی اور۔

اس طرح ڈیکارٹ کے میتھڈ نے وسیع پیمانہ پر وہ ذہنی ماحول تشکیل دیا جس میں فائدے کی متلاشی عقلی توانائیاں پروان چڑھیں گی۔ جو نئی تہذیب کی علامت ہیں۔

سائنس کیا ہے؟

یہی وہ مقام ہے جہاں ہم اسلام اور سائنس کے عمومی تعلقات کا اندازہ لگا سکتے ہیں، اس لیے کے مظاہر قدرت کی دنیا کے مقابلے میں مسلمان انسان کا موقف، اور قرآنی متن کے زیر اثر اسلامی ذہن اپنے لیے جو راہ اختیار کرے گا، اور جس نئے عقلی ماحول میں یہ ذہن ترقی کرے گا یہ سب در حقیقت مسئلہ کے مختلف بنیادی پہلو ہیں۔

سائنس بذات خود معلومات کا مجموعہ اور اسے حاصل کرنے کے طریقوں کے مجموعے کا نام ہے۔ لیکن اس تعریف میں جو ہم نے سائنسی ترقی کی تاریخ کے نقطہ نظر سے کی ہے کچھ اور اضافہ کرنا ہوگا۔ کیونکہ سائنسی ترقی صرف اسی گوشے تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ اس کے لیے متعدد ذہنی اور سماجی شرائط لازم ہیں جو منفی یا مثبت طریقہ پر اثر انداز ہوتی ہیں اس طرح کہ وہ یا تو اس کی ترقی

کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنی یا اسے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کریں گی۔

اس کو اس طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ جب گلیلیو نے سورج کے گرد زمین کے گھومنے کا نظریہ پیش کیا تو اسے کسی علمی مخالفت کا نہیں بلکہ مذہبی عقائد کے اختلاف کا سامنا کرنا پڑا۔ گلیلیو کو کسی سائنسی اکیڈمی نے مجرم قرار نہیں دیا تھا بلکہ ایک مذہبی عدالت نے عیسائی عقیدہ کے تحفظ کے نام سے اسے مجرم قرار دیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ گلیلیو کو جبر و محرومی کے متعدد عوامل نے مجرم قرار دیا تھا جو اسے موت کی سزا دینے والے اس معاشرہ کی ذہنیت میں جاگزیں تھے۔

اس بات کی حقیقت اور مفہوم کو سمجھنے کے لیے ہمیں ڈیکارٹ سے پہلے کے اس یورپی معاشرے کو دیکھنا ہوگا جس نے فلکیات کے ایک بڑے سائنسدان کو موت کی نیند سلا دیا تھا۔ اس معاشرہ میں نجومی کو ایک اہم ترین مشیر کا مقام حاصل تھا جیسے نوسٹراڈموس جو فرانس کے ایوان شاہی میں ملکہ کاترینا کا مشیر خاص تھا۔

اس امر کی مزید وضاحت کے لیے یہ بتانا ضروری ہے کہ اگر یہ گلیلیو اسلامی معاشرہ میں زندگی گزار رہا ہوتا (باوجودیکہ اس دور میں تہذیب روبہ زوال تھی) تو اسے ان حالات کا سامنا نہ کرنا پڑتا جو اس کی علمی تحقیق کی راہ میں رکاوٹ بنے اور نتیجۃً اسے اپنی زندگی سے ہاتھ دھونا پڑا۔ چوتھی صدی ہجری کے اوائل میں اس دور کا ایک بڑا ملحد ابن الراوندی تھا جس کا تذکرہ الزرکلی نے اپنی کتاب میں کیا ہے۔ ابن الراوندی نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرتے ہوئے کہا تھا:

لقد تحجر عریضاً ابنُ ابی کبشۃ حین ادعی أنہ خاتم الأنبیاء

(ابن ابی کبشہ نے کس ڈھٹائی سے آخری نبی ہونے کا دعویٰ کیا ہے)۔ سب کو معلوم ہے کہ یہاں "ابن ابی کبشہ" سے کون مراد ہے۔ اسلام کی عظیم ترین ہستی

کی شان میں گستاخی کے باوجود ابن الراوندی پر مقدمہ چلانے اور اسے مجرم قرار دینے کے لیے کوئی مذہبی عدالت نہیں بلائی جاتی تاہم اسے اپنی گستاخی کا نتیجہ خود بھگتنا تھا۔ اس نے سفر حج کے دوران مکہ کے راستہ میں خودکشی کرلی۔

اس سے بڑھ کر کوئی یہودی کسی سانحہ سے دوچار ہونے بغیر خود قرآن کی شان میں گستاخی کرسکتا تھا۔ اس کو صرف کسی جواب کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ مثلاً قرآن کے بارے میں اندلس کے ایک یہودی کی دریدہ دہنی کے خلاف ابن حزم نے بڑا موثر جواب دیا تھا جو رسالۃ ابن النجریلۃ کے نام سے مشہور ہے۔

اس طرح کی انتہاپسندی کے واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ اس نئے ذہنی ماحول میں، جب اسلامی معاشرہ دنیا کے لیے ایک اعلیٰ نمونہ اور مثالی معاشرہ تھا آزادئ فکر و خیال کو زبردستی ختم نہیں کیا جاتا تھا۔

اسلامی تاریخ میں فکری جبر کی مثالیں شاذ و نادر ہی ملیں گی۔ جیسے مامون کے دور میں خلق قرآن کا مسئلہ تھا۔ ان حالات میں بھی بعض امور ایسے تھے جو فکری جبر کی شدت کے عوامل کو ممکن حد تک کم کر دیتے تھے۔ یہ امور اسلامی ضمیر میں قرآنی تعلیمات کے زیر اثر جاگزیں تھے۔ آیئے دیکھیں کہ نزول وحی کے بعد سے کیسا ذہنی ماحول تشکیل پا رہا تھا:

نزول وحی کے بعد کا ذہنی ماحول

عہد نامہ قدیم میں باب پیدائش کی ابتدا کائنات کے مادی مظاہر سے ہوتی ہے۔ انجیل یوحنا کے عہد نامہ جدید کی ابتدا تجسیم کے عمل سے ہوتی ہے۔ جب کہ قرآن کی ابتدا ذہنی پہلو لیے ہوئے ہوتی ہے اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ "پڑھ اپنے رب کے نام سے"۔۔۔

"اِقْرَأْ" ۔۔۔ یہ پہلا لفظ ہے جو پہلے اسلامی ضمیر یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ضمیر پر وارد ہوتا ہے، اس کے بعد ہر مسلمان کے ضمیر پر اپنے

لیے جگہ بناتا چلا جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ الفاظ ہی روح اور پیغام و بیان کا وسیلۂ اظہار ہیں۔ وہ ہر معرفت کے حامل اور علامت ہوتے ہیں۔ نزول قرآن کا اولین لمحہ "اقرأ" کی شکل میں الفاظ کی اہمیت کی نشاندہی، ان کے موضوع کا خصوصی تذکرہ اور اسلامی ضمیر میں ان کی قدر و قیمت کو ثبت کر دیتا ہے۔

لفظ، روح کو منتقل کرتا اور اس کے پیغام کو پہنچاتا ہے اور اس کے ساتھ اسے ضائع ہونے سے محفوظ رکھتا ہے۔ یہ لفظ سب سے پہلے خود قرآن کی حفاظت کرے گا یہ وہ کتاب ہے جس کا چودہ سو سال سے ایک حرف بھی نہیں بدلا جا سکا۔ اس کے برعکس دور قدیم سے دور جدید تک کی تمام کتابیں ہیں جن کی تاریخی صداقت کو جدید تنقید علمی توثیق کے بغیر صرف علامتی حیثیت میں قبول کرتی ہے۔

یہ خصوصیت اس جدید فکر کا پہلا علمی نتیجہ تھی جو قرآنی فضا میں پروان چڑھی۔ اس ماحول کا آغاز ٹھیک اس وقت ہوا جب سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں نوخیز اسلامی معاشرہ نے قرآنی آیات کو جمع کیا تاکہ انہیں ضائع ہونے سے بچایا جا سکے اور ان کا اس طرح احاطہ کیا جا سکے کہ کسی قسم کی تبدیلی کی گنجائش باقی نہ رہے سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی سربراہی میں ایک کمیٹی نے یہ کام انجام دیا تھا در حقیقت منہج (میتھڈ) کے مطابق یہ پہلا علمی کام تھا۔ زیر بحث موضوع میں اس کی تفصیلات کا تذکرہ ممکن نہیں لیکن تدوین قرآن میں جس تدقیق سے کام لیا گیا ہے اسے جدید تنقید کی نظر میں قابل ستائش ہونا چاہیے۔

در حقیقت یہ فکر اسلامی کا ہی نہیں بلکہ اس انسانی فکر کا پہلا علمی کارنامہ تھا جس نے قابل تقلید مثالی شخصیت کے سامنے بے چوں چرا سر جھکا کر اپنی طویل تاریخ میں بارہا ٹھوکریں کھائی ہیں، بلکہ اس جدید دور میں بھی بسا

اوقات انسانی فکر کے قدم ڈگمگاتے ہیں۔ اس سلسلے میں سوویت یونین کی مثال دی جا سکتی ہے، جہاں بائیولوجی جدید سائنسی قافلہ سے تیس سال پیچھے رہ گئی کیونکہ لیسنکو نے خود کو قابل مثال نمونہ سمجھ لیا تھا۔

تمام انسانی معاشروں کی تاریخ بتاتی ہے کہ انہیں اپنی ذہنی عمر کی ترقی کے مختلف مراحل میں اس طرح کی رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

انسانیت اپنی ذہنی ترقی کے عمل میں عمر کے بالعموم تین مراحل سے گزرتی ہے۔ عمر کے پہلے دور (ایام طفولت) میں وہ اپنے فیصلے "عالم الاشیاء" (مادی اشیاء کی دنیا) کے معیار کے مطابق کرتی ہے۔ اس طرح کہ اس کا معمولی سا فیصلہ بھی حس پر مبنی یا ابتدائی ضرورت کے مطابق ہوگا۔

اپنی عمر کے دوسرے دور میں انسانیت کے اپنے فیصلے مثالی نمونہ کے اصول و معیار کے مطابق ہوں گے اور ان کا تعلق "عالم الاشخاص" (اشخاص کی دنیا) سے ہوگا۔ اس مرحلہ میں فکر و خیال تجسیم سے دور نہیں ہوتا۔ اس کی ساری قیمت اس ذات پر منحصر ہے جو ہماری نظروں میں فکر و خیال کا مجسم نمونہ ہوتا ہے۔

اس کے بعد انسانیت بلوغ کے مرحلہ، یعنی اپنی عمر کے تیسرے دور "عالم الافکار" (افکار کی دنیا) میں داخل ہوتی ہے۔ اس وقت افکار کی بذات خود اپنی حیثیت ہوتی ہے۔ اس کے لیے "عالم الاشیاء" یا "عالم الاشخاص" میں سے کسی کی توثیق کی ضرورت نہیں رہتی۔

یہاں اس بات پر غور کرنا ضروری ہے کہ انسان جب عقلی پختگی کی عمر کو پہنچ جاتا ہے تو فکر اپنی قدر و قیمت کی بقا کے لیے اشخاص یا "اشیاء" کی محتاج نہیں رہتی۔ آگے آنے والی ایک قرآنی آیت اس صورت حال کو پوری طرح واضح کر دے گی۔ ہمیں معلوم ہے کہ اسلامی فکر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے کسی حد تک مربوط تھی۔ جس معاشرے میں اسلام کی دعوت دی جا رہی

تھی، اس کی نظروں میں یہ فکر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں مجسم تھی۔

لیکن قرآن کریم چاہتا تھا کہ اس کی آیات اس قید سے آزاد ہو جائیں تاکہ جدید معاشرہ بھی اس قسم کی تمام قیود سے آزاد ہو جائے جو علم و فکر کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ بن سکتی ہیں۔

چناں چہ یہ آیت نازل ہوئی:

وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ أَفَإِنْ مَاتَ أَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلَى أَعْقَابِكُمْ ...؟ (آل عمران : ١٤٤)

(محمد اس کے سوا کچھ نہیں کہ بس ایک رسول ہیں۔ اس سے پہلے اور رسول بھی گزر چکے ہیں۔ پھر کیا اگر وہ مر جائیں یا قتل کر دیے جائیں تو تم لوگ الٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟) اس آیت کے نزول نے نوخیز معاشرے کو مادی اشیاء اور شیئیت کے دور سے نکال کر فکر کے دور میں پہنچا دیا۔

علم کی حقیقت

ہم دیکھتے ہیں کہ نزول "اقرأ" کے بعد سے اس معاشرہ کے نفسیاتی خدوخال میں تبدیلی واقع ہوئی، جس کے نتیجے میں ایک نیا ذہنی ماحول وجود میں آیا۔ اس کے ساتھ اس ماحول پر ایسے تجربات کیے جا رہے تھے تاکہ نوخیز اسلامی ضمیر میں اس کی شکل خوب واضح ہو جائے۔ قرآن سوال کرتا ہے

هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ (الزمر : ٩)

(کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے دونوں کبھی یکساں ہو سکتے ہیں؟)

مذکورہ آیت جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے سوال کی شکل

میں ظاہر ہوتی ہے۔ وہ درحقیقت اسلامی ضمیر میں علم کی قیمت بٹھانے، اور نئے معاشرہ میں جاہل کے مقابلہ میں اہل علم کی فوقیت کا اعلان تھا۔

اگر چند لفظوں میں علم کا مفہوم بیان کیا جائے تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ ہر میدان میں حقیقت کی تلاش کا نام علم ہے خواہ وہ اخلاق، قانون اور سماجیات ہوں یا طب طبیعیات وغیرہ۔

البتہ اس تلاش کی راہ میں رکاوٹیں پیدا ہو سکتی ہیں اور وہ تلاش بے راہ بھی ہو سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ہم کسی وہم کو حقیقت سمجھ لیں اور خیالات میں بھٹک جائیں۔ بسا اوقات خیالات غلط بھی ہوتے ہیں۔ علم کو ایسے حالات کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے جن میں عقل شک و یقین کی کیفیت میں مبتلا ہو۔ اسے ان حالات کے مقابلہ کے لیے عقل کو تربیت دینا چاہیے۔

قرآن نے اس پہلو کو نظر انداز نہیں کیا ہے، بلکہ وہ اشارہ و کنایہ سے اس طرف توجہ مبذول کراتا ہے۔ مثلاً وہ حقیقت اور وہم کا فرق۔ یہودیوں کی بدعنوانی اور گمراہی کے واقعات سنا کر واضح کرتا ہے:

وَمِنْهُمْ أُمِّيُّونَ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتَابَ إِلَّا أَمَانِيَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ (البقرة: ٧٨)

(ان میں ایک گروہ امیوں کا ہے جو کتاب کا علم نہیں رکھتے۔ بس اپنی امیدوں اور آرزوؤں کو لیے بیٹھے ہیں اور محض وہم و گمان پر چلے جا رہے ہیں۔)

یہاں نفس کا میلان، شک و شبہ اور محض امکانات بے یقینی کی مختلف

کیفیتیں ہیں۔ انہیں ہم ایک روشن "حقیقت" کے بالمقابل نہیں رکھ سکتے جو ذہنی یقین کی واضح ترین شکل کی نشاندھی کرتی ہے۔

ایک دوسری قرآنی آیت میں اس روش کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے جو زیر بحث موضوع کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لیے بغیر ان مسائل پر بحث کرے جن کا اسے کوئی علم نہیں ہے:

هَا أَنتُمْ هَؤُلاءِ حَاجَجْتُمْ فِيمَا لَكُمْ بِهِ عِلْمٌ فَلِمَ تُحَاجُّونَ فِيمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهِ عِلْمٌ؟ (آل عمران :٦٦)

(تم لوگ جن چیزوں کا علم رکھتے ہو ان میں تو خوب بحثیں کر چکے۔ اب ان معاملات میں کیوں بحث کرتے ہو جن کے بارے میں تمہارے پاس کوئی علم نہیں)

یہ قرآنی آیات اسلامی فکر کو علم کی راہ پر گامزن کرتی ہیں اور حصول علم کے لیے اسے بہتر طریقہ کار کی ہدایات دیتی ہیں۔ اس اعتبار سے قرآن کے نظام تعلیم و تربیت کا تفصیلی مطالعہ ضروری ہے۔ تاہم قرآنی تصور کو حدیث شریف نے عملی طور پر ان احکام کی شکل میں پیش کیا ہے جن کا تعلق براہ راست مسلمان کی روزمرہ زندگی سے ہے:

"علم کا حصول ہر مسلمان پر فرض ہے۔"

"علم حاصل کرو خواہ اس کے لیے چین کا سفر کرنا پڑے۔"

"علماء کی روشنائی شہیدوں کے خون سے افضل ہے۔"

اس قسم کی احادیث عملی طور پر ان ذہنی تنصیبات کو مزید مستحکم کرتی ہیں جو فکر اسلامی میں قرآن کے زیر اثر قائم ہوئی تھیں، تاکہ یہ اسلامی فکر اپنے

علمی، سیاسی اور معاشرتی کردار کو بہتر طریقے پر انجام دے سکے۔

قرآن کے جس نظام تربیت نے نئے معاشرے کو عقلی ذمے داریوں کے لیے تیار کیا تھا اس کے اثرات فرد کے طریقۂ عمل اور زندگی کے معمول کے مطابق تجربات میں بھی نمایاں نظر آتے ہیں، مثلاً حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ ایک دن مدینہ کی کسی گلی سے گزرتے ہوئے اپنی عادت کے مطابق قرآن پڑھتے جا رہے تھے۔ جب وہ ان آیات پر پہنچے:

أَنَّا صَبَبْنَا الْمَاءَ صَبًّا ثُمَّ شَقَقْنَا الْأَرْضَ شَقًّا. فَأَنْبَتْنَا فِيهَا حَبًّا، وَعِنَبًا وَقَضْبًا وَزَيْتُونًا وَنَخْلًا وَحَدَائِقَ غُلْبًا وَفَاكِهَةً وَأَبًّا

(عبس : ۳۱)

(ہم نے اوپر سے پانی برسایا۔ پھر زمین کو پھاڑا۔ پھر ہم نے اس میں غلہ، انگور، ترکاری، زیتون، کھجور، گنجان باغ اور میوے اور چارہ پیدا کیا)

حضرت عمر نے "ابّا" کے لفظ پر توقف کیا اور محسوس کیا کہ انہیں اس لفظ کے معنی معلوم نہیں ہیں۔ اب آیئے دیکھیں کہ حضرت عمر اس مشکل کو کیسے حل کرتے ہیں۔ حضرت عمر لغت کے عالم نہیں ہیں۔ اس وقت تک یہ علم وجود میں نہیں آیا تھا، اس کو کتاب العین کے مؤلف الخلیل بن احمد الفراهیدی نے رائج کیا، جنہیں آج کی اصطلاح میں "لسانیات" کا بانی کہنا چاہیے۔ حضرت عمر مفسر بھی نہیں تھے۔ وہ تو صرف عام انسان تھے، ایک ایسا عملی انسان جو اپنے دائرہ کار سے باہر کے امور میں دخل دینا پسند نہیں کرتا، ورنہ قرآن کی اس گرفت میں آجائیں گے جس کے لیے یہودیوں کی سرزنش کی گئی ہے

فَلِمَ تُحَاجُّونَ فِيمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهِ عِلْمٌ ...

(ان معاملات میں کیوں بحث کرتے ہو جن کے بارے میں تمہارے پاس کوئی علم نہیں ہے)

ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت عمر نے اس لفظ پر چند لمحہ توقف کیا، کیونکہ

ایک لفظ کے معنی کی ناواقفیت مومن کے ضمیر کے لیے ترقی کے مفہوم کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنتی۔ حضرت عمر کے نزدیک اس وقت مسئلے کا تعلق علم کے دائرہ سے نہیں بلکہ طریقۂ عمل سے تھا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ انہوں نے خود اپنی سرزنش کر کے اس مسئلہ کو حل کر لیا۔ انہوں نے کہا:

"عمر کا اَبّا سے کیا تعلق؟ 'اَبّا' سے ناواقف ہے تو کیا ہوا؟ عمر! یہ اپنے آپ کو خواہ مخواہ مشقت میں ڈالنا ہے"۔

اس کے بعد حضرت عمر اپنے معاملات کی طرف متوجہ ہو گئے جہاں بڑی بڑی ذمہ داریاں ان کی منتظر تھیں۔ اسی طرح ایک بار حضرت عمر نے عورت کے مہر کی حد مقرر کرنا چاہی، اس لیے کہ ان کے خیال میں وہ مناسب مقدار سے زیادہ وصول کیا جا رہا تھا۔ لیکن اس وقت ایک عورت نے یہ کہتے ہوئے ان کی مخالفت کی "اے عمر! اللہ نے آپ کو اس کا حق نہیں دیا" اور پھر اس عورت نے یہ آیت پڑھی:

وَإِنْ أَرَدْتُمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ وَآتَيْتُمْ إِحْدَاهُنَّ قِنطَارًا فَلَا تَأْخُذُوا مِنْهُ شَيْئًا ۚ أَتَأْخُذُونَهُ بُهْتَانًا وَإِثْمًا مُّبِينًا (النساء : ۲)

(اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی لانے کا ارادہ کر لو تو خواہ تم نے اسے ڈھیر سارا مال ہی کیوں نہ دیا ہو اس میں سے کچھ واپس نہ لینا۔ کیا تم اسے بہتان لگا کر اور صریح گناہ کر کے واپس لو گے؟)

حضرت عمر خاموش ہو گئے اور پھر کہا: "اے عمر! سب لوگ تم سے زیادہ ذی علم ہیں۔ یہاں تک کہ یہ بوڑھی عورت بھی۔ اور اس طرح حضرت عمر نے اپنی رائے سے رجوع کر لیا۔

ان دونوں حالتوں میں تجربات کے سامنے عقل کا موقف واضح ہو جاتا ہے۔ پہلی حالت میں نئے ماحول کے زیر اثر عقل ظاہری قید و بند یعنی الفاظ کی بالادستی سے آزاد ہو جاتی ہے جو علم کی ترقی کی راہ میں اکثر رکاوٹ بنتی ہے۔

دوسری حالت میں حضرت عمر ہٹ دھرمی سے باز رہتے ہیں جو حقیقت کی ازلی دشمن اور اس کے حصول کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔

اسلام کی ابتدائی تاریخ میں متعدد ایسی مثالیں ملیں گی جو قرآن کے زیر اثر نئے تشکیل شدہ عقلی ماحول کی نشاندہی کرتی ہیں۔ مثلاً حضرت علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ نہروان کے معرکہ کے دوران نجومی کی رائے کی پروا کیے بغیر اس کے بتائے ہوئے مقررہ وقت کے بجائے قصداً کسی دوسرے وقت جنگ شروع کرتے ہیں اور دشمن پر غالب رہتے ہیں۔ پھر انہوں نے لوگوں سے کہا "اگر ہم نجومی کے بتائے ہوئے وقت پر جنگ شروع کرتے تو وہ کہتا کہ ہمیں ستاروں کی چال کی بدولت فتح نصیب ہوئی ہے"۔

لیکن دوسرے موقع پر یہی حضرت علی زیاد بن النظر کو پرچم دے کر کہتے ہیں "تمہیں ان مجاہدین کی قیادت کرنا ہے ان کے اہل علم کے مشورے سے فائدہ اٹھاؤ اور ان کے جاہلوں کو تعلیم دو"۔

یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ اسلامی فکر اس نئے ماحول میں فرد کے لیے ایک زینہ تیار کرتی ہے جس کے ذریعہ وہ بلندی تک پہنچ سکتا ہے۔ وہ کم علم کو سکھاتا اور ذی علم سے سیکھتا ہے اس طرح علم و معرفت کی یہ برقی رو دونوں رخ پر دوڑنے لگے گی۔ بسا اوقات یہ رو نیچے سے اوپر آتی ہے مثلاً مہر کی حد مقرر کیے جانے کے موقع پر حضرت عمر کے خلاف عورت کا اعتراض۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اسی زینہ کی بدولت فکر اسلامی دور جاہلیت کی "شیئیت" (مادیت) سے نکل کر ان بلندیوں تک پہنچی جہاں سے اس نے تاریک دنیا کو علم کی روشنی سے منوّر کر دیا۔

آج مستشرقین کی تحریروں میں جب ہم ان بلندیوں کی جھلک دیکھتے ہیں تو ہماری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں۔ اور ہم خیال کی وادیوں میں کھو جاتے ہیں۔ لیکن یہی مستشرقین اگر مسلمانوں کے ان علمی کارناموں کا انکار

کرتے ہیں تو ہم احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ دونوں ہی حالتوں میں مستشرقین کی یہ تحریریں ہمارے ذہنوں میں دوطرفہ محرومی کا احساس پیدا کرتی ہیں۔ اس سے ہم اسی حالت میں نجات حاصل کر سکتے ہیں جب ہم قرآن کے تیار کردہ اس زینہ کو دیکھیں جسے طے کر کے انسانی فکر ان علمی کارناموں کی بلندیوں تک پہنچی ہے جنہیں آج ٹکنالوجی کی ترقی کا بام عروج سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً ریاضی کا اعشاری نظام، الجبرا، کیمیاء، بایولوجی کے متعدد اصول، طبیعیات اور فلکیات۔

جب ہم علم کے اس زینہ پر نظر ڈالیں تو ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ اگر اسلامی معاشرہ چاہے تو یہ علمی زینہ اس وقت بھی اس کے قبضہ میں بلکہ اس کے قدموں میں آسکتا ہے۔ ہمیں صرف یہ فیصلہ کرنا ہے کہ فکر اسلامی کی جانب سے انسانیت کے علمی سرمایہ میں اضافہ کا مسئلہ صرف ان کارناموں پر منحصر نہیں ہے جنہیں ایک مستشرق اپنی مرضی سے ثابت کرے یا ان کا انکار کرے۔ بلکہ "اقرأ" کے نزول کے بعد سے قرآنی مفہوم کے زیر اثر عقلی فضا اور عقلی ڈھانچہ میں جو بنیادی تبدیلی رونما ہوئی وہ اس کا حقیقی معیار ہے۔

اس جائزے کی روشنی میں مستشرقین کی تحریروں کے بارے میں اپنے موقف کے تعین کے لیے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اولاً ہم مستشرقین کی تحریروں کی علمی قیمت سے انکار نہیں کر سکتے بلکہ بسااوقات وہ قابل ستائش ہوتی ہیں جیسے سیڈیو، گوستاف لوبون اور آسین پلاتھیوس کی تحریریں جو علمی لحاظ سے قابل احترام ہیں اور اہل علم کی غیر جانبدارانہ رائے میں اعلیٰ اخلاقی پہلو بھی لیے ہوئے ہیں۔

بنیادی پہلو

لیکن ہم زیر بحث موضوع کا ایک بنیادی پہلو نظر انداز کر دیں گے اگر اس پر غور نہ کریں کہ بیسویں صدی کا تمام فکری کام جو تاثیر اور فعالیت کے

اعتبار سے اعلیٰ معیار کا ہے اس کا ایک عملی پہلو بھی ہے جس سے سیاست اور منفعت پسندی کے میدان میں ناجائز فائدہ بھی اٹھایا جا سکتا ہے۔ اس طرح اعلیٰ اور بے قیمت دونوں طرح کے افکار سے ضمیر و عقل کی تسخیر کا کام لیا جا سکتا ہے۔

اعلیٰ اور گھٹیا دونوں قسم کی کتابیں پریس سے باہر آتی ہیں۔ بسااوقات ان کے مصنفین کی لاعلمی میں، ان ماہرین کے ہاتھوں تک پہنچ جاتی ہیں جو انہیں فکری کشمکش کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اس طرح وہ ہنگامہ آرائی، اخلاقی بے راہ روی اور صرف توجہ ہٹانے اور بہلانے کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔ اس قسم کی کتابیں جب یورپ کے کسی شہر سے شائع ہوتی ہیں تو اسی وقت کسی عرب دارالحکومت سے اس کا عربی ایڈیشن بھی شائع ہو جاتا ہے۔

اس مطابقت پر ان ملکوں میں بھی توجہ نہیں دی جاتی جو فکری کشمکش کے ناپسندیدہ اثرات سے دوچار ہیں۔ ان ملکوں کو یہ تک خبر نہیں کہ اس فکری کشمکش کے ذرائع اور مقاصد کیا ہیں، بلکہ وہ اس کے مفہوم سے بھی ناآشنا ہیں، گویا وہ محض ایک بے معنی لفظ ہو۔

آیئے کسی روشن خیال شخص سے پوچھیں۔ وہ مبہم اور غیر واضح جواب دے گا .... فکری کشمکش؛ غالباً آپ فلسفہ وجودیت، مارکسیت اور سوریالزم کا ذکر کر رہے ہیں! اگر آپ نے اپنے سوال کی مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ نہیں جناب! میں اس مارکسیت کا ذکر کر رہا ہوں جس کا مارکس سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ محض چند الفاظ اور نعرے ہیں جنہیں ہمارے نوجوانوں کو اس لیے سکھایا جاتا ہے کہ ہمارے بعض حکام کے خیال میں مارکسیت کو صرف ایک ذریعہ بنا کر اس سے اسلام کے خلاف کام لیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح اس فلسفہ وجودیت کو ہمارے وجود سے کوئی سروکار نہیں اور نہ سوریالزم کا فن سے کوئی واسطہ ہے۔ یہ اشیاء درحقیقت نئی نسل کے ذہنوں پر اثر انداز ہونے کے ذرائع ہیں، جنہیں

اس مقصد کے لیے وہ حلقے استعمال کر رہے ہیں جو ان کے فلسفیانہ، فنی یا سماجی پہلو کے قائل نہیں ہیں۔

میرا اشارہ ڈائجسٹ قسم کی ان کتابوں کی طرف ہے جو مفت یا بہت معمولی قیمت پر نوجوانوں میں تقسیم کی جا رہی ہیں، تاکہ ان کی جیب پر بوجھ نہ پڑے اور وہ اپنے ضمیر پر اثر انداز ہونے والے ان افکار کو بآسانی قبول کر لیں۔

لیکن صد افسوس کہ نام نہاد روشن خیال لوگ اس گفتگو کے مفہوم کو نہیں سمجھ سکتے۔ان کی نگاہوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں۔ آپ دونوں کے درمیان کوئی قدر مشترک نہیں۔ وہ بزعم خود فکری سطح پر ہیں۔ جہاں غیروں کے افکار کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ان کا کہنا ہے: خیال اپنا اپنا پسند اپنی اپنی۔ اس پر بحث کی ضرورت نہیں۔

دوسری طرف غالباً آپ نظریاتی سطح پر ہیں۔ جہاں ہر نئی فکر کا مائیکرو سکوپ سے تجزیہ کرنا چاہیے کیونکہ اس سطح پر ایک فکر محض فکر نہیں رہ جاتی جسے صرف فکری یا فنی نقطہ نظر یا صاحب فکر کے عزائم کی روشنی میں دیکھا جائے گا۔ بلکہ اس فکر کو اسے اپنے مقصد کے لیے استعمال کرنے والوں کے حقیقی عزائم کے اعتبار سے پرکھا جائے گا۔

بہرحال آپ کی باتوں کو وہ لوگ اس لیے نہ سمجھ سکیں گے کہ وہ دنیا کی فکری کشمکش کے مفہوم کو دو بڑی طاقتوں کی چپقلش تک محدود رکھتے ہیں۔

زیر بحث موضوع کے مطابق ہمیں مستشرقین کی تحریروں کا صرف ان کی ذاتی اور فکری خصوصیات اور عزائم کے نقطہ نظر سے جائزہ نہ لینا چاہیے بلکہ اس پہلو سے بھی دیکھنا چاہیے کہ کون لوگ مستشرقین کی تحریروں کو عالم اسلام میں اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

ان مقاصد میں، جیسا کہ ہم پہلے نشاندہی کر چکے ہیں، تسخیر عقل و ضمیر بھی شامل ہے۔ اسے ہم اس طرح سمجھ سکتے ہیں کہ ہر وہ نظریاتی خلا جہاں

ہمارے افکار معدوم ہوں گے اسے ہمارے مخالف اور معاند افکار سے پر کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

یہ ایک عام اصول ہے جس سے فکری کشمکش کے ماہرین بخوبی واقف ہیں۔ لیکن یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ یہ ماہرین محض ایسے دانشور نہیں ہیں جو حقیقت برائے حقیقت کی جستجو کر رہے ہیں۔ بلکہ وہ اسے سیاسی مفادات کے میدان میں عملی شکل دینا چاہتے ہیں۔ اس طرح وہ نظریاتی خلا ظاہر ہونے کا انتظار نہیں کریں گے تاکہ اسے پر کر سکیں۔ بلکہ یہ خلا وہ خود پیدا کریں گے۔ ہو سکتا ہے اس خلا کو عارضی طور پر دوسروں کے افکار سے پر کر دیں تاکہ پہلے مرحلے کے طور پر وہ ہم کو ہمارے افکار سے جدا کر سکیں۔

درحقیقت یہ وہ میدان نہیں ہے جہاں "خط مستقیم" کے اصول کے تحت کام ہوتا ہو۔ ایک منطقی عمل کا منطقی نتیجہ ہی نکلے گا۔ اس کے برعکس فکری کشمکش کی اپنی ایک علٰحدہ منطق ہے۔ عموماً اس کی راہ پرپیچ ہوتی ہے۔ یہاں ایک مرحلے سے دوسرے مرحلے تک درمیانی اور پرپیچ راہوں سے پہنچا جاتا ہے۔

مثال کے طور پر یہ نقلی مارکسزم جو بائیں بازو کے خیالات کے حامل ہمارے نوجوانوں کو گھول کر پلائی جا رہی ہے صرف ایک درمیانی مرحلہ ہے۔ جس کا مقصد ہمارے نوجوانوں کے ایک طبقہ کو وطنی نظریاتی محاذ سے علٰحدہ کرنا ہے۔ علٰحدگی کی اس کاروائی کا اعلیٰ ذمہ دار، نوجوانوں کی اس جماعت سے یہ تو کہہ نہیں سکتا کہ ہم آپ کے ملک میں ترقی کی رفتار کم کرنا چاہتے ہیں، اس لیے کیا آپ ان افکار و خیالات کی تحریف و تنقیص میں ہماری مدد کریں گے جو ترقی کی اس رفتار کو برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ اس لیے کہ اس قسم کی باتوں کو سراسر یاوہ گوئی اور جنون کہا جائے گا۔

اب اس کے سامنے صرف ایک ہی راہ ہے کہ وہ نوجوانوں کی اس جماعت کو بیرونی افکار کے پل سے دوسرے کنارے تک لے جائے جہاں

نقلی مارکسسٹ،فریبی قوم پرست اور انقلاب کی نقابیں اوڑھے ہوئے افراد نظر آئیں گے۔

اس کارروائی کا پہلا نتیجہ یہ نکلا کہ وطن کا اخلاقی اتحاد ختم ہوگیا۔ جب کہ آزادی کے بعد کے اہم اور نازک مسائل کا سامنا کرنے کے لیے اسے اس اتحاد کی اشد ضرورت تھی ۔ اس کارروائی کے فکری نتائج جس قدر ہمارے نوجوانوں پر اور سماجی نتائج جس قدر ہمارے معاشرہ پر ظاہر ہوں گے اسی قدران مسائل میں کمی کے بجائے اضافہ ہوتا چلاجائے گا۔ اس طرح ان نوجوانوں کی شکل میں فکری کشمکش کے ماہرین کے ہاتھوں میں ہماری نکیل ہوگی۔

ایک شبہہ اور اس کاازالہ

ہوسکتا ہے کہ مستشرقین کے زیر بحث موضوع سے ہماری ان باتوں کا بظاہر کوئی تعلق نظر نہ آرہا ہو۔ لیکن سچ پوچھئے تو یہ موضوع سے علحدہ نہیں ہیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم پوری کارروائی کا مجموعی اور مکمل جائزہ لیں وہ اس طرح کہ فکری کشمکش کے یہ ماہرین ایک طرف نوجوانوں کی ایک جماعت کو اسلام کے مخالف خیالات کا انجکشن دے کر انہیں پاگل کتوں کی طرح بھونکنے کے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔ دوسری طرف یہی ماہرین ہمارے نوجوانوں کی ایک دوسری جماعت کو مستشرقین کی تحریروں سے تیار کردہ خواب آور گولیاں مہیا کرتے ہیں۔

اس طرح ہمارے دونوں قسم کے نوجوانوں کے خلاف کارروائی جاری ہے ایک ہیجان انگیزی کے زیر اثر فکری طور پر مفلوج دوسرا خواب آور دوا کی وجہ سے فکری طور پر ناکارہ۔ ایک ہنگامہ آرائی پر آمادہ اور دوسرا خوابوں کی دنیا میں مست۔ یہ اس ملک کا حال ہے جہاں آزادی کے بعد کے مسائل کا سامنا کرنے کے لیے بے حد تنظیم وضبط اور بیدار مغزی کی ضرورت ہے۔

ہمارے خیال میں فکری کشمکش کے دائرے میں مستشرقین کی تحریروں کا یہی کردار ہے۔

ہم کیا کریں؟

اب سوال یہ ہے کہ اس دائرہ میں ہمارے فکری عمل کی کیا صورت ہونی چاہیے؟ یہاں مجھے یہ کہنے کی اجازت دی جائے کہ تفصیلات کو نظرانداز کرکے صرف اس خیال کی نشاندہی کی جاسکتی ہے جو زبان زدِ ہر خاص وعام ہے کہ صرف سیاسی آزادی کا حصول ہی کافی نہیں اسے معاشی آزادی کے ذریعہ مستحکم کرنا ضروری ہے۔

یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے لیکن ہم اس میں اتنا اضافہ کرنا چاہیں گے کہ جو معاشرہ اپنے بنیادی افکار خود وضع نہیں کرتا وہ نہ تو ضروریات زندگی کی اشیاء تیار کرسکتا ہے اور نہ صنعت کاری کے لیے لازمی مصنوعات۔ ایک زیر تعمیر معاشرہ درآمد شدہ افکار سے تعمیر نہیں کیا جاسکتا۔ خواہ یہ افکار استشراق سے ماخوذ ہوں یا اشتراکیت سے۔ کیوبا کا تجربہ ایک واضح مثال ہے وہ کتابوں کے بجائے عملی تجربہ سے اپنی راہ خود پیدا کررہا ہے(۱)

اسی طرح ہمیں بھی اپنا ذاتی تجربہ حاصل کرنا چاہیے۔ اور اپنے دائرہ فکر وعمل کا تعین خود کرنا چاہیے نہ کہ کسی اور کی طرف سے ہمارے لیے متعین کیا جائے۔ آخری بات یہ کہ فکر کے میدان میں اپنا حقیقی وجود اور آزادی بحال کرکے ہی ہم معاشی اور سیاسی آزادی حاصل کرسکتے ہیں۔

---

(۱) فاضل مصنف کی یہ رائے اُس زمانہ میں کیوبا کے بارے میں رائج معلومات سے متاثر ہے۔ یاد رہے کہ یہ تحریر عربی میں پہلی بار ۱۹۶۹ء میں شائع ہوئی ہے (مترجم)۔

فہرست مضامین